بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

وہ گراں قدر رفیق جو تحریک اسلامی کے ساتھ اوّل روز سے چلے تھے "منھم من قضیٰ نحبہٗ" کے بمصداق اپنا فریضہ باحسن وجوہ انجام دے گئے، ان کی صف میں سے اب چند حضرات "منھم من ینتظر" کے مقام پر باقی رہ گئے ہیں۔ اس چھوٹے سے حلقہ یارانِ طریق میں سب سے کم تر درجے کا ایک فرد میں بھی ہوں۔

ان معزز و مکرم ہم سفروں کے ساتھ مجھ جیسا ناچیز آدمی بھی یہ دولتِ افتخار رکھتا ہے (اور اس کی بھاری ذمہ داریاں)، کہ میں نے ۵ افراد پر مشتمل تحریک دارالاسلام اور اس کے بعد ۱۹۴۱ء میں ۷۵ موسسین جماعت اسلامی کے ساتھ بیٹھ کر دین کے عقاید اور نصب العین کی روشنی میں اقامتِ دین یا غلبۂ اسلام کی جس تحریک کا آغاز کیا اس کی تقریباً ساڑھے تینتالیس سالہ سرگرمیاں میرے سامنے عمل میں آئیں، حالات کے مختلف پیچ و خم سے گزرتے ہوئے جو فیصلے ہوئے اور جس طرح کے اقدامات کئے گئے ان کا میں گواہ ہوں۔ بہت سے معاملات میں خود میں نے تحریک کی یا دلائل دیے۔ بے شمار قراردادوں اور بیانوں کے ڈرافٹ میں نے تیار کیے۔ پمفلٹ لکھے، مضامین شائع کرائے، خط و کتابت کی، نوجوانوں نے جب اسلامی جمعیت طلبہ کے مختصر سے حلقے کا آغاز کیا تو مولانا مودودیؒ کے ساتھ اس کی نشست میں میں بھی موجود تھا۔ اور اس وقت جس مقصد اور نصب العین کے مقرر کرنے اور کام کے جس نقشے پر چلنے کا فیصلہ ہوا میں اس کا گواہ ہوں۔ قراردادِ مقاصد کے پاس ہونے پر جماعت کے نقشہ کار اور پالیسی میں جو ناگزیر تبدیلی آئی اس کی بحثوں کا بھی مجھے علم ہے۔ پہلے انتخابات جن میں پنجاب تک

سسٹم بنا کر جماعت نے حصہ لیا ، اس سسٹم اور اس کے متعلقہ عہد نامے کی تیاری میں میرا حصہ رہا ۔ مولانا کی پہلی نظر بندی (ملتان) کے دور میں نظر بندکیوں؟ والا پمفلٹ میں نے لکھا جس کے اثرات اس دور کے اصحاب جانتے ہیں ۔ میرے سامنے ایک گروہ کی علیحدگی جماعت سے ہوئی ۔ پھر جتنے بھی انتخابات ہوتے رہے ان کے ہونے کے بعد یہ جائزہ دے کر احتساب کیا جاتا رہا کہ اس دوران میں اخلاقی حدود اور اصولی تقاضوں کو کہاں کہاں نظر انداز کیا گیا ۔ کئی بار متحدہ محاذ بنے اور ٹوٹے ، ہر بار کے تجربے سے فائدہ بھی ہوا اور بعد کی ناکامی کے زخم بھی کارکنوں کے دلوں میں رہ گئے ۔ اشتراکیت پسند اور لادینیت پسند طبقوں کے ساتھ اتحاد کی اگر اکا دکا صورت تجربۃً عمل میں آئی بھی تو اس کا آخری نتیجہ یہی نکلا کہ ایسے عناصر کے ساتھ سیاسی ضرورتوں کے لیے محاذ نہ بنائے جائیں ۔ اور اگر کوئی محاذ بنے تو ایسی صورت میں جبکہ غلبۂ اسلام کو ایک اصول کے طور پر مانا جائے ۔ بحالیٔ جمہوریت کے لیے متعدد بار متجانس عناصر کے ساتھ بھی رابطہ ہوا مگر بالعموم اس صورت میں کہ اسلامی رجحانات اور پاکستان کی سالمیت و استحکام کو پسند کرنے والا عنصر غالب رہے ۔

لیکن بہر صورت پچھلا سارا دور اس کڑی پابندی کے ساتھ گزرا کہ ہمارے تمام فیصلوں اور اقدامات میں اسلام اور اس کے تقاضے بطور اصل الاصول کارفرما رہے ۔ اور خدا کا شکر ہے کہ یہ حالت تاحال باقی ہے ۔ مگر پھر بھی حالات کے بھنور آج اس بُری طرح ہمارے رفقاء کے سفینوں کو گھما رہے ہیں کہ اپنے آپ کو ایک طرح کا انتباہ دینے کی ضرورت ہے ۔

یہ سطور میں نے اپنی شان میں قصیدے کے طور پر نہیں لکھی ہیں بلکہ اس ذمہ داری کے احساس سے لکھی ہیں کہ کاروانِ اقامتِ دین کے ہر راہگیر کو اب تک کے لمبے دور کی روشنی میں توجہ رہے کہ اس کا رُخ اقدام کیا ہے ۔ ضروری نہیں کہ میری گزارشات ہر کسی کے لیے مؤثر یا قابلِ توجہ ہوں ، مگر یہ مجھے یقین ہے کہ آج نہیں کل اور موجودہ نسل نہیں تو بعد کی کوئی نسل ، اور میرے ملک میں نہیں تو باہر کے کسی ملک میں کبھی نہ کبھی ان باتوں کو پڑھا جائے گا اور ان پر غور کیا جائے گا ۔ میں صرف اپنے ضمیر کے تقاضے سے خدا کی خوشنودی کے لیے لکھ رہا ہوں ۔ وہ اگر راضی ہو تو اور کسی کی مجھے پروا نہیں ، اور وہ اگر ناپسند کرے تو میں ہزار بار

معافی کا خواستگار ہوں۔

یہ چند باتیں محض یاد دہانی ہیں ــــ خود میرے اپنے لیے بھی، اور مخلص رفقائے مقصد کے لیے بھی اور عام مسلمانوں کے لیے بھی ــــ یہ سب کچھ ہمارے لٹریچر میں موجود ہے، مگر بسا اوقات ہم خود اپنی ہی فکر اور اپنی ہی دعوت اور اپنے ہی مقاصد سے غافل ہو جاتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ کبھی کبھی پرانی باتیں تازہ ہوتی رہیں۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ اندازِ بیان میں کچھ تھوڑا سا نیا رنگ پایا جائے۔

حرفِ اوّل

دین وسیاست کی تفریق کی جو لمبی صدیاں ہم پر گزری ہیں، اُن کی وجہ سے ایک عرصۂ دراز سے دین وسیاست کے دائرے الگ الگ ہو گئے۔ اہلِ دین نے کہا کہ سیاست دُنیاداری ہے اور اس کی ضرورتوں کے ساتھ اسلام کے ایمانی واخلاقی تقاضے صحیح سلامت رہ ہی نہیں سکتے۔ اور اہلِ سیاست نے طے کر لیا کہ سیاست جس نت نئے ہیر پھیر اور اُتار چڑھاؤ کے ساتھ چل سکتی ہے۔ اس میں انفرادی دینداری کی کچھ باتیں تو کھپ سکتی ہیں، مگر سچے خدا پرستانہ اُصول ومقاصد کو برقرار نہیں رکھا جا سکتا۔ یعنی دین پسند ہو تو سیاست حرام، اور سیاست پسند ہو تو دین سے چھُٹی۔ یہ دونوں چیزیں یک جا اور یک جان نہیں ہو سکتیں۔ بدقسمتی سے بعض ائمہ اور مجددین کی مساعی، تحریکوں اور قربانیوں کے باوجود ہماری یہ دُوئی ہر دَور میں غالب رہی۔

پھر انگریزی دَورِ مغرب کا لادینی طرزِ سیاست ساتھ لایا اور اس سے اثر پذیر معاشروں میں "یک بام و دو ہوا" کا فتنہ اور بڑھ گیا۔ جس نے دین کو پسند کیا اس نے مسجد، مدرسہ اور خانقاہ کو سنبھالا اور دُنیا کے خیر وشر سے قطعِ تعلق کر لیا۔ اور جس کو سیاست کے کارزار میں حصہ لینا پسند آیا، اُس نے تخت یا تلوار سنبھالی، نعرے ایجاد کیے، عوام کو آج ایک مقصد سے بھڑکایا اور کل دوسرے مقصد سے، آج "الف" سے دشمنی ہوئی اور "ب" سے دوستی تو کل "ب" سے ہم پیالگی وہم نوالگی قائم ہوئی اور "الف" سے کُٹی ہوئی، محاذ کا رُخ کبھی

مشرق کی طرف اور کبھی مغرب کی طرف۔ اہل سیاست کا مقصد حصولِ اقتدار یا تحفظِ اقتدار یا خاتمۂ اقتدار اور تبدیلیٔ اقتدار قرار پایا اور ان کا قانون اوّل و آخر "قانون ضرورت" بن گیا۔ اس طرح بے اُصولی اور مطلب برآری اور وقت وقت کی نئی بولیاں اُصول بن گئیں۔ نتیجہ یہ کہ دین داری کا مزاج خانقاہی بنا اور سیاست کا مزاج جنگی و تصادمی۔ جہاں اس طرح کی دینداری آئی وہاں سیاست کے دروازے بند، اور جہاں اس انداز کی سیاست بازی آئی وہاں دین کے چشمے خشک!

یہ تھا اُس دَور کا عظیم ترین فتنہ جو صدیوں ہمارے اعمال کی آبیاری سے پنپتا رہا اور نئے دَور میں خوب برگ و بار لایا۔

اس فتنے کے خلاف برصغیر میں جس طرح پہلے کے اکابر ملت جن میں حضرت مجدد الف ثانیؒ اور شاہ ولی اللہ اور سیدین شہیدین نے فکر اور عملی دونوں حیثیتوں سے مؤثر کام کیا، وہاں حکیم اقبالؒ اور مولینا مودودیؒ نے بڑی زبردست فکری مہم چلائی کہ ذہنوں کو اس تخیل باطل کے شجرۂ خبیثہ سے پاک کر دیا جائے۔ اور مولینا مودودیؒ نے تو عملاً صحیح و جامع تصورِ دین کے تحت کئی سال تک ایک تحریک عملاً چلا کر دکھا دیا کہ دین کے تمام حدود و قیود کو قائم رکھ کر سیاست کی اصلاح کی سعی کی جاسکتی ہے۔ انتخابات اور پارلیمانی ایوانوں میں حصہ لیا جاسکتا ہے، عوامی حرکات جاری کی جاسکتی ہیں۔ اس طرح ہر قسم کی سیاسی تگ و تاز کے ساتھ تمام اسلامی عقاید، عبادات، اخلاقیات اور پیمانہ ہائے خیر و شر کو بلا کسی ردّ و بدل کے برقرار رکھا جاسکتا ہے۔ یہ نئی دعوت بجائے خود بڑی انقلابی دعوت تھی جس کو آگے بڑھانے کے لیے ایک طرف مذہبی طبقوں کی طرف سے پتھروں کی بوچھاڑ کو سہنا پڑا اور دوسری طرف آزاد سیاست کے علمبردار سیکولرسٹ مسلمانوں کی صفوں کی جانب سے تیر کھانے پڑے، مگر بحمداللہ کہ ہماری دعوتِ حق نے ذہنوں کو دلائل سے فتح کیا، یہاں تک کہ نوخیز نسلوں نے بھی اس کو دوسروں سے بڑھ چڑھ کر اپنے اندر جذب کیا۔

اب مشکل یہ پیش آرہی ہے کہ ہم خود اپنے ہی وضع کردہ اور اعلان کردہ تصوّرِ وحدتِ دین و سیاست کے بارے میں جب کبھی ٹھوکریں کھاتے ہیں تو ایک طرف اسلامی انقلاب

کے کارکنوں کے ذہنوں میں خطرناک بگاڑ پیدا ہوتا ہے اور دوسری طرف وحدتِ دین وسیاست کے تصور کی دعوت ہمارے مخاطب خواص وعوام کے لیے کمزور ہونے لگتی ہے۔

میری عاجزانہ درخواست ہے کہ دینی وسیاسی سرگرمیوں میں انتہائی احتیاط کے ساتھ توازن قائم کیا جائے۔

حرف دوم

یہ امر ہر معاملے اور ہر مرحلے میں ہمارے سامنے رہنا چاہیے کہ دین کو ایجاد کرنے والے ہم نہیں ہیں۔ بلکہ اسلامی تحریک کے اُصول ومقاصد سے لے کر اس کے طریقہ ہائے اقدام تک خدا کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنّت کے پابند ہیں۔ ہم اس گھوڑے کی طرح نہیں ہیں جس کی اگاڑی پچھاڑی کھلی ہو اور وہ جس کھیت میں چاہے گھسے اور اس کی فصل چرتا پھرے یا جس باغ میں چاہے جا کر لوٹنیاں لگائے اور گل وگیاہ کو روند ڈالے۔

جب بھی کوئی مرحلۂ اقدام آئے یا کسی کارروائی کے لیے غور وفکر کیا جائے تو پہلے یہ سوچ لیا جائے کہ طریقِ قرآن اور طریقِ رسولؐ کیا ہے۔

زمانے کے حالات اور تقاضوں کے تغیر کے ساتھ اجتہاد کیا جا سکتا ہے مگر شرائطِ اجتہاد اور اُصولِ اجتہاد کے ساتھ۔ آپ امورِ منصوص یا سنّتِ محکمہ کو کسی بھی قانونِ ضرورت کے تحت بدل نہیں سکتے۔ اور اگر نصوص کے جنگلوں کو پھاندنا ہو تو پھر آخر اس تکلف کی سرے سے ضرورت ہی کیا ہے کہ ہم سیاسی بے راہ روی کے ساتھ یہ دعوے بھی کریں کہ ہم تو اقامتِ دین کا کام کرنے چلے ہیں، " لہٰذا جو بھی راستے میں آئے گا کٹ جائے گا"۔

آپ کو یہ امر بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ پارلیمانی انتخابات کی مخصوص سیاست ضروری نہیں کہ آپ کو اسلامی انقلاب کے آخری مرحلے تک پہنچا دے۔ اب جب کہ آپ اصلاً " دعوت" ہی کے مرحلے میں ہیں، آپ کو سیاسی جد وجہد کو بھی کسی قدر احوال کی اصلاح کے جذبے کے ساتھ اُصولاً دعوت ہی کے لیے ایک ذریعۂ اثر اندازی بنا کر استعمال کرنا ہے۔

اب اگر ہماری سیاسی سرگرمیاں لوگوں کے سامنے ہمارا ایسا کردار پیش کریں اور ہمارے بیانات اور اعلانات اور اداروں کے قیام، نعروں اور سلوگنوں کی ایجاد اور بعض تبدیلیوں کے لیے اپیل کے طریقوں اور دوسری پارٹیوں کے ساتھ اتحاد و اختلاف کی ایسی تصویر پیش کریں کہ جس کی وجہ سے خود ہماری اصل ہی کا اعتبار اُٹھ جائے تو اگر ہم نے اقتدار کا بڑا حصہ اور جمہوری ایوانوں میں بہت سی سیٹیں بھی حاصل کر لیں تو ایسی جیت میں فی الحقیقت ہماری ہار پوشیدہ ہے۔

آج جب کہ سیاسی احوال و مسائل کی تند موجیں تیزی سے ہمارے سروں پر سے گذر رہی ہیں، ایسے میں مسلم کردار وہ ہے جو ذہنی توازن کو اُسی طرح برقرار رکھے، جس طرح آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے طائف میں پتھر کھا کر اور اپنے خون کی دھاریں اس خاک میں چھوڑ کر برقرار رکھا تھا۔

یہ ہمت نہیں تو اقامتِ دین کا نام لینے کے بجائے کوئی دوسرا کام کیجیے۔

حرف سوم

اسلامی تحریک میں جدید دَور کی اصطلاح کے مطابق ریڈیکل ازم یا استعجال پسندانہ اندھا جوشِ تیز رفتاری نہیں پایا جاتا۔ ریڈیکل ازم یہ ہوتا ہے کہ ایک بڑی جماعت میں سے ایک مختصر گروہ اس جذبے سے سر اُٹھاتا ہے کہ وہ ان اُصول و حدود اور تاریخی تسلسلِ کار کے بعض تقاضوں کو توڑ کر جلدی سے آگے بڑھ جائے گا اور آناً فاناً انقلاب لے آئے گا[1] بلکہ دوسرے لفظوں میں یہ کہیے کہ وہ مارکسی تصوّر کی اصطلاح میں تاریخ کو جست لگانے پر مجبور کر دے گا یا نئے انداز سے کہیں تو وہ دس بیس برس بعد کے انقلاب

---

[1] عالم اسلام کی دینی تحریکوں میں کہیں کہیں یہ رجحان انقلابِ ایران کے ظہور کے بعد اُبھرا ہے حالانکہ انقلابِ ایران کا عمل بہت پیچھے سے شروع ہو کر یہاں تک پہنچا اور وہاں کے حالات کی کچھ خصوصیات بھی ہیں جن پر دوستوں کی نظر نہیں۔

کو بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا حال کے لمحے تک لے آئے گا۔[1]

اس قسم کا ریڈیکل ازم لوگوں کو ایڈونچرسٹ یا کارنامہ گر (بہ اصطلاح عام مہم جو) بنا دیتا ہے۔ وہ قسم قسم کے نئے اصول اور نئے تجربے ایجاد کرتے ہیں۔ اور ہر قسم کے اصول اور تجربے کے بعد وہ یہی سمجھتے رہتے ہیں کہ اسلام سلامت ہے، آخر اسلام کو کیا خطرہ؟ وہ کوئی کانچ کا بنا ہوا تو نہیں ہے۔

اسی نظریے کے تحت فارورڈ بلاک بنتے ہیں اور جہاں فارورڈ بلاک بنتے ہیں وہاں عام دنیوی سیاسی جماعتوں میں اندر ہی اندر ایک رسہ کشی چلتی رہتی ہے، لیکن دینی سیاسی جماعتوں کے ذہنوں میں پہلے انتشار پیدا ہوتا ہے، پھر بحران اور آخر کار شکست و ریخت ہونے لگتی ہے۔

لہٰذا خدا را اپنے آپ کو ریڈیکل ازم اور فارورڈ بلاک جیسے تصورات سے بچائے رکھیے۔ یہ راستہ جس کا میں ذکر کر رہا ہوں بالآخر تخریب و تشدد کی طرف جاتا ہے۔ اسلامی دعوت میں کوئی کشش باقی نہیں رہتی جب وہ تخریب و تشدد کے راستے پر پڑ جائے، اسلامی انقلاب کے راستوں پر چلنے والوں کی سب سے بڑی قوت "مظلومیت" ہوتی ہے اور یہی مظلومیت چاروں طرف دل و دماغ کو فتح کرتی جاتی ہے۔

حرف چہارم

دینِ برحق کی تحریک چاہے کسی مرحلے میں ہو، خاص طور پر دعوت کے ابتدائی یا ارتقائی مراحل

---

[1] بھارت میں تقسیم سے قبل کی کانگریس کے ہوتے ہوئے پہلے پہل تھوڑا سا ریڈیکل رجحان جواہر لال نہرو میں تھا مگر مہاتما گاندھی کے نظریہ عدم تشدد نے اس نورس رجحان کو زیادہ ابھرنے نہیں دیا۔ بعد میں جوں جوں نہرو صاحب پر ذمہ داریاں بڑھتی گئیں وہ کانگریس کی بنیادی پالیسی کے علمبردار بنتے گئے۔ اسی طرح ایک تجربہ سوبھاش چندر بوس کا تھا، مگر جیسا وہ تجربہ تھا اور جو کچھ حشر اس کا ہوا سب کے سامنے ہے۔

یں، اس کے لیے ایسا جوش کارآمد ہے جو ہوش کے تحت رہ سکے، ایسا اقدام مفید ہے جو تدبر و تفکر سے اٹھایا جائے، ایسا انقلابی عمل نتیجہ خیز ہے جو صبر و حکمت کا پابند ہو۔ ہر کام جو کیا جائے، پہلے اس کے متعلق شرعاً یہ سوچ لیا جائے کہ یہ کیسا ہے اور سنتِ نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام اور سنتِ صحابہ (خصوصاً خلفائے راشدین) رضوان اللہ علیہم اجمعین کی روشنی میں اس کی حیثیت کیا ہے۔ پھر اس کام کا پورا نقشہ تیار کیا جائے، سوچنے میں یہ ملحوظ رکھا جائے کہ حامی قوتیں کونسی ہیں، مخالف کونسی، اور ان کے درمیان کس طرح اقدام کیا جاسکتا ہے کہ حمایت میں اضافہ ہو اور مخالفت میں کمی، یا مخالفت زیادہ ہو بھی تو وہ دوسروں کی حمایت کو اور بڑھا دے۔ غور کر لینا چاہیے کہ کسی جنگ کے لڑنے کی صورت میں فتح ہوئی تو کیا ملے گا اور شکست ہوئی تو نتائج کیا ہوں گے؟ آپ کے مصروفِ کشمکش ہونے سے دوسری کونسی طاقتیں ہیں جو اپنا میدان پیدا کرنے کا فائدہ اُٹھائیں گی؟ کس وقت کے حالات کیسے ہوں گے؟ کس مرحلے میں کیا طریقے کارگر ہو سکتے ہیں؟ پھر کیا کسی معرکے میں آپ کی قیادت آپ کے کارکنوں کو پابندِ حدود اور وابستۂ اخلاق رکھ سکے گی؟ آپ ظلم کو مٹانے کے لیے یا اسے کمزور کرنے کے لیے ظلم کا طریقہ تو اختیار نہ کریں گے، جھوٹ کے توڑ کے لیے جھوٹ سے تو کام نہ لیں گے، جبر و تشدد کے خلاف آواز اُٹھاتے ہوئے خود تو جبر و تشدد کی حرکات نہ کرنے لگیں گے؟

یہ ساری چیزیں اگر وقت پر توازن سے نہ سوچی جاسکیں اور جوشِ اقدام اور جنونِ انقلابیت غالب ہو جائے تو پھر آپ جو چاہیں کریں، آپ دینِ برحق کی اقامت کا حق اللہ کی نگاہ میں ادا نہیں کر سکتے۔

فیصلہ کن چیز تو آپ کا کردار ہے۔ کیا آپ کا کردار کسی مہم میں ایسا رہے گا کہ عوام متاثر ہو جائیں؟ پولیس اور جیل کا عملہ متاثر ہو جائے؟ بیوروکریسی کی صفوں میں آپ کے قدردان پیدا ہو جائیں؟ اخبارات اور سیاسی لیڈر آپ کی دعوت کا لوہا ماننے لگیں کہ کیسی اعلیٰ دعوت اور مقدس نصب العین ہے جس نے اس درخشاں کردار کے ساتھ ظلم کے سامنے کھڑے ہونے والے انسان پیدا کیے ہیں؟

یہاں میں ایک مثال دیتا ہوں۔ ۱۹۷۴ء کے قادیانی ایجی ٹیشن کے زمانے میں مولینا مودودیؒ جہاں ایک طرف قادیانیت کو دائرہ اسلام سے باہر سمجھتے تھے اور حکومت سے یہ منوانا چاہتے تھے کہ قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے، وہاں وہ اس بات کے سخت خلاف تھے کہ ایک تو مسئلہ دستور کی اسلامی بنیادیں طے کرانے کی لب بام پہنچی ہوئی تحریک کو مؤخر کر دیا جائے۔ اور دوسرے یہ کہ لاقانونیت کا راستہ اختیار کیا جائے۔ مولینا پر اس زمانے میں سخت دباؤ تھا۔ بہت زیادہ بیرونِ جماعت سے اور کسی قدر خود جماعتی کارکنوں کی طرف سے بھی۔ لیکن مولینا اپنے اُصولی موقف پر چٹان کی طرح مضبوطی سے جمے رہے۔ مجھے اُس مجلس شوریٰ کا حال یاد ہے جب کہ قادیانی ایجی ٹیشن کے متعلق جماعت کے رویّے کا فیصلہ کرنے کی بحثیں ہو رہی تھیں، اور بیچ بیچ میں ہر دو چار منٹ بعد کبھی فیصل آباد سے اور کبھی ملتان سے اور کبھی راولپنڈی سے اور کبھی لاہور کے کسی علاقے سے جوش انگیز خبروں کے ٹیلی فون آرہے تھے۔ اور جب آپریٹر کی کوئی چٹ پڑھ کر سنائی جاتی تو ذہنوں میں افکار کا سارا تانا بانا بکھر جاتا۔ مگر مولینا مودودیؒ ٹھنڈے دل سے چٹ ایک طرف رکھ کر زیر غور مسودہ کو پھر پڑھنے میں لگ جاتے اور اس کے الفاظ اور جملوں پر گفتگو ہوتی۔ ایک جملہ پورا ہوتا تو پھر ایک ٹیلیفونی پیغام آجاتا اور پھر وہی صورت۔ مگر کام پھر اسی تدبّر و تفکّر کے ساتھ ہونے لگتا جیسے پہلے ہو رہا ہوتا۔ یہاں تک کہ تحریر مکمل ہوگئی اور سب ارکان اس پر مطمئن ہوگئے۔

جذباتیت سے اس طرح ماورا رہ کر اُصول پسند تحریکوں کے لیڈر اور مشیر اور کارکن حکمت و تدبّر سے کام کرتے ہیں۔

میرا مشورہ یہ ہے کہ جسے یہ کام آئندہ کرنا ہو، تحریک خواہ کسی بھی مرحلے میں ہو، وہ اِس طرح کے دل و دماغ لے کر آئے۔ جذباتی ہیجانات اور اندھے فیصلوں کے ساتھ دوسرے انقلاب چل سکتے ہیں، مگر اسلامی انقلاب کا کام نہیں ہو سکتا۔

حرف پنجم

اسلامی سیاست کی راہ پر کبھی کوئی منفی کام بھی کرنا پڑ سکتا ہے۔ مثلاً راستے سے کسی

روڑے یا کانٹے کو ہٹا دینا تاکہ آگے بخوبی چلا جا سکے۔

لیکن اُصولاً اسلامی سیاست منفی سیاست نہیں ہے۔

منفی سیاست کے یہ معنی ہیں کہ آپ کا سارا زور اس بات پہ ہو کہ فلاں کے دورِ اقتدار کو ختم کرنا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایسے کسی "لا" کے بعد "الا" کیا ہوگا۔ برصغیر کی تاریخ میں آج تک ہر طرف سے طرح طرح کی جماعتیں منفی سیاست کی علمبردار بن کے کام کرتی ہیں۔ کسی حکمران سے اذیت اُٹھانے کے بعد وہ اس غرض کے جمع ہو جاتی ہیں کہ اور جو کچھ ہو، اس شخص سے نجات ملے۔ حالانکہ ہمارا اصل کام یہ ہے کہ یا تو ایک اُصول کو ختم کرکے اپنا دوسرا اُصول غالب کریں، یا کسی شخص کے ہٹائے جانے کے بعد اس سے بہتر شخص کو کرسی پہ بٹھانے کا قابلِ اطمینان منصوبہ رکھتے ہوں۔ ورنہ خالص منفی سیاست وہی رنگ اختیار کرے گی جیسا یہ تھا کہ انگریزوں کے تسلط کو ختم کرنے کے لیے کتّوں اور سُوروں کے ساتھ بھی اتحاد کیا جا سکتا ہے۔

اس منفی سیاست کا ایک تجربہ ایوب خاں کا خاتمہ تھا۔ پھر قوم کو کیا ملا؟ یحییٰ خاں، یحییٰ خاں گیا تو ذوالفقار علی بھٹو کو چھوڑ گیا۔ بھٹو کے خلاف طوفان اُٹھا اور ان کی کشتی اُلٹ گئی۔ پھر کیا ملا؟ ایک نیا مارشل لا جس کی عمر مسلسل بڑھتی رہی ہے۔ اس مارشل کو ہٹا دیکھیے اس کے بعد کیا ملے گا، یا تو ایک اور مارشل لا، یا ایسی جمہوریت جس کی لایعنیت کی مار کھا کر قوم پھر چیخ اُٹھے گی۔ اِس اندھے جوئے کے لیے ہم اتحاد قائم کرنے بھی چلیں تو اور نہیں تو کم سے کم نفاذِ اسلام کی شرط ساتھ ہو، کم سے کم مظلوم افغانوں کی ہمدردی و حمایت کی شرط ساتھ ہو، کم از کم انسانوں کو خدا کے عطا کردہ حقوق کی بحالی کی ضمانت ساتھ ہو، کم از کم منکرات و فواحش اور مخلوط معاشرے کے فروغ کی روک تھام کی یقین دہانی ساتھ ہو۔

کیا ایسے جوئے میں ایم آر ڈی سے اتحاد موزوں رہے گا؟ پیپلز پارٹی سے موزوں رہے گا؟ سوشلسٹوں اور سیکولرسٹوں سے موزوں رہے گا؟ تمام بھلی بُری جماعتوں سے موزوں رہے گا؟

ہمارے کندھوں پہ اُصولوں اور اعلانوں کا ایک پُشتارہ لدا ہے۔ ہمارے تاریخی

تسلسل کی روداد کا طومار ہماری بغلوں میں ہے۔ کتاب وسنّت کی کسوٹیاں سامنے رکھی ہوتی ہیں۔ ان چیزوں کو چھوڑنے سے ہم موقع پرستوں (OPPORTUNISTS) کی تعریف میں داخل ہو جائیں گے۔ ایک مرتبہ کا غلط اقدام ہماری پچھلی ساری تاریخ کو دریا بُرد کر دے گا۔ اور ہمارے کردار کا برسوں پرانا کھرا سکّہ کھوٹا ہو جائے گا۔

ہمیں یہ بھی زیر غور رکھنا ہے کہ ہزار ہا لوگ جو ہماری طرف محبت و عقیدت کی نظریں اٹھائے ہم سے رہنمائی لینا چاہتے ہیں، کیا ان کے ذہن پراگندہ نہ ہو جائیں گے۔

کسی گٹھ جوڑ کے بجائے جس کے نتیجے میں زیادہ سے زیادہ بے اصول اور آزادی پسند لیڈروں کا غلبہ قائم ہو جائے، ہمارے لیے ممکن اور صحیح راہ عمل یہی ہے کہ ہم تنہا اپنی بازی اپنے شرائط پر کھیلیں اور دوسروں کو پاؤں رکھ کر چڑھنے کے لیے اپنا کندھا پیش نہ کریں۔ لیکن اگر اتحاد حالات کے تحت مفید اور ضروری ہی سمجھا جائے تو پھر صرف محبانِ دین و وطن کے ساتھ اتحاد کیا جائے۔

یوں بھی سارے اتحاد دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔ اگر اتحاد ہوا تو صدر صاحب جن لوگوں کو اپنی پارٹی قرار دے رہے ہیں (اور ان میں کچھ اور قوتیں بھی شامل ہیں) آنا تو اُن کو ہے۔ پھر کیوں نہ اپنا کھیل صرف اپنے بل بوتے پر کھیلا جائے، خواہ چار، پانچ یا دس پندرہ سیٹوں ہی کے لیے ہو۔

جب تحریک کی پالیسی اس بارے میں طے پا جائے گی تو میں بھی ہر دوسرے ساتھی کی طرح اسے قبول کروں گا — بادلِ ناخواستہ یا خواستہ!

حرف ششم

اس دَور میں ہر جگہ طلبہ کی نوجوان قوت کی اہمیت بڑھی ہے اور نوجوان قیادت کے غلغلے بلند ہوئے ہیں۔ ہمارے ہاں جن لوگوں نے ان سلوگنوں کو بطور ایک نئے نظریے کے قبول کیا ہو، میں انہیں غلط سمجھتا ہوں۔

جب اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی قیادت کے لیے بالعموم چالیس برس پورے کرنے

پر انبیاء کو دعوت الی اللہ اور قیادتِ جماعت کے لیے اُٹھایا ہے تو پھر اسلامی اُصولوں کے تحت اسلامی مقاصد کے لیے کام کرنے کے لیے نوجوانوں کو خالد جانباز رضی اللہ عنہ تو بننا چاہیے مگر صدیق و فاروق رضی اللہ عنہما کی جگہ نہیں لینی چاہیے۔ اوّل الذکر بزرگ نے خالد کو آگے بڑھایا، وہ زور شور سے آگے بڑھے، مؤخر الذکر بزرگ نے ان کو یک لخت پیچھے ہٹا دیا، حضرت خالد نے ادب سے اس حکم کے آگے سر جھکا کر اپنے آپ کو ایک عام سپاہی کی جگہ کھڑا کر لیا۔ نہ کوئی گلہ نہ کوئی شکایت، نہ احتجاج۔ پہلے بھی اللہ کی رضا مطلوب تھی، اب بھی اللہ ہی کی رضا سامنے تھی۔ پہلے بھی خلیفہ اوّل کو اُمت کے قائد کی حیثیت سے واجب الاحترام سمجھا، بعد میں بھی خلیفۂ دوم کے حکم کی اطاعت نہایت ادب سے کی۔ حضرت خالد نے تاریخِ اسلام میں وہ عظیم الشان مثال چھوڑی ہے کہ آج کے ہر صاحب صلاحیت نوجوان لیڈر کو اس سے سبق لینا چاہیے۔

نوجوانوں کا کام ہے کہ والدین کا ادب کریں، اساتذہ کا احترام کریں، اپنے ہم مرتبہ نوجوانوں سے اختلافات کرتے ہوئے رواداری سے کام لیں، کوئی بات منوانے کے لیے تشدد سے کام نہ لیں اور احیائے اسلام کے کام کے لیے جو بزرگ میدان میں موجود ہوں (اور جن کے خلوص پر انہیں اعتماد ہو) اُن سے رہنمائی لیں اور مشورے حاصل کریں اور وہ اگر کسی امر میں روک دیں تو اسلام کے ایک اطاعت پسند سپاہی کی حیثیت سے رُک جائیں۔

اگر عمر کے ابتدائی جوشیلے مرحلوں میں دل و دماغ کو اس طرح تربیت نہ دی گئی تو آگے چل کر پھر اپنے آپ پر بریک لگانا ممکن نہیں ہوگا۔

میں جب اس طرح کی باتیں نوجوانوں سے کہتا ہوں تو انہیں پسند نہیں آتیں، بلکہ انہیں خوشامدانہ لہجہ بہت مرغوب ہوتا ہے۔ لوگوں نے انہیں چاٹ ڈال دی ہے کہ ان کی منت سماجت ہوتی رہے، مگر میں سمجھتا ہوں کہ اہم دینی اُمور اور بڑے بڑے معاملات و اقدامات سے متعلق اخلاقی تقاضوں کو اُن پر اچھی طرح واضح نہ کرنا مداہنت ہے۔ میں اُن سے بہت محبت بھی رکھتا ہوں، مگر میں دینی معاملات میں اُن سے مداہنت نہیں برت سکتا۔

اس قوم کی مستقبل کی امیدیں ان سے وابستہ ہیں کہ شاید کل یہ لوگ تحریکِ اسلامی کے علمبردار بن کے اٹھیں گے، لہٰذا اسلامی ذہن کے نوجوانوں کو ایمان و اصول اور اخلاق و شائستگی کا پورا پورا لحاظ رکھتے ہوئے اپنے اعتماد کے بزرگوں سے (جن کو بھی وہ پسند کریں) رہنمائی حاصل کریں اور تقاضا کریں کہ ہماری غلطیاں بھی واضح طور پر ہمیں بتائی جائیں تاکہ ہم ان سے پرہیز کریں اور ہمیں راہ صداقت پر اقدام کے لیے صاف صاف لفظوں میں ہدایات بھی دی جائیں تاکہ ہم اُن کی پابندی کریں۔

احتیاط

ترجمان القرآن میں ضرورتِ استدلال کے لیے آیات و احادیث شائع ہوتی رہتی ہیں۔ قارئین سے گذارش ہے کہ جن اوراق پر آیات و احادیث ہوں۔ اُن کا خاص احترام ملحوظ رکھیں تاکہ بے ادبی نہ ہونے پائے۔

(ادارہ)

خواتین کیلیے تین خوبصورت کتابیں

۱۔ شمعِ حرم	محمد یوسف اصلاحی	-/۱۲ روپے
۲۔ عورت اور اسلام	جلال الدین عمر	-/۹ 〃
۳۔ عورت قرآن کی نظر میں	شمیمہ محسن	-/۱۲ 〃

البدر پبلی کیشنز - ۲۳ راحت مارکیٹ - اردو بازار لاہور